منیر رپورٹ سے منیر رپورٹ تک

(ریٹائرڈ جسٹس منیر صاحب کی تازہ کتاب پر ایک نظر)

جناب نعیم صدیقی صاحب

یہ سمجھ کر کہ یہ کتاب ۱۹۷۹ء کی ایک اہم کتاب ہوگی، میں نے اپنے مصروف اوقات میں خاص طور سے گنجائش نکالی کہ اُسے بغور پڑھوں۔ میرا اشارہ ہے، ریٹائرڈ فاضل جسٹس منیر صاحب کی کتاب "فرام جناح ٹو ضیا" کی طرف۔ مجھے افسوس ہوا کہ دس ڈالر کی اس چھوٹی سی کتاب میں کوئی نیا مواد نہیں بلکہ وہی کچھ ہے جسے منیر رپورٹ میں پڑھ چکا تھا۔ منیر رپورٹ جس دور سے متعلق تھی اس کی گرما گرمی سے گزر کر جب میں نے اُس پر غور کیا تو مجھے اندازہ ہوا کہ فاضل مرتب کا کچھ ذہنی کامپلیکس ہے جس نے لفظوں، لکیروں اور نقطوں کی شکل میں ایک عنکبوتی جالے کی ہیئت اختیار کر لی ہے۔ رپورٹ کے صفحات پر عنکبوتی جالا اس طرح پھیلا ہوا ہے کہ تحقیقاتی عدالت کے قیام کا اصل منشا غت ربود ہو گیا ہے۔ وہاں ایک فوقیت یافتہ شخص کو جو اتفاق سے اضطرابات پنجاب کی تحقیقاتی عدالت کا صدر بھی تھا، کارروائی پر حاوی بھی رہا، اور جس نے نتائج تحقیقات کی رپورٹ بھی مرتب کی، اُس نے کچھ ذہنی آسودگی ضرور حاصل کر لی۔ یہ رائے میں نے اس وجہ سے قائم کی ہے کہ جس زور سے اس رپورٹ میں سیکولرازم کی تبلیغ کی گئی ہے اور پڑھنے والے کے ذہن پر اسے ٹھونسنے کا اہتمام کیا گیا ہے، نیز جس بُری طرح اسلام کو چرکے لگانے کے لیے علماء کو نشانۂ تحقیر و تمسخر بنایا گیا ہے، یہی یک طرفہ انتہا پسندانہ رنگ کسی بڑے ذہنی ردِّ عمل کا سراغ دیتا ہے۔ اسی ذہنی ردِّ عمل نے ساری بحث و گفتگو کو توازن سے محروم کر دیا ہے۔ یہی نہیں، اس میں وہ حقیقی

شائستگی اور پابندیٔ آداب ملحوظ نہیں ہے جو سنجیدہ سطح پر علمی — خاص طور پر دینی — موضوعات پر اختلافی گفتگوؤں میں شرفاء کا شعار ہے۔ یہاں تو صاف طور پر جناب متکلم اپنے حق میں نہ صرف دعوائے علم رکھتے ہیں۔ بلکہ کسی قدر کبرِ علم — علم بھی محض دنیوی یا قانونی امور تک محدود نہیں، بلکہ دین و شریعت کا علم بھی شامل دعویٰ ہے۔ ادھر دوسرے فریق کی کوتاہیٔ علم اور اس کی کم فہمی کا تذکرہ بھی ہے اور ساتھ ہی تضحیک بھی۔ خصوصاً یہ امر قابلِ غور ہے کہ تحقیقاتی عدالت کا جج صحیح طور پر ایک غیر جانب دار جج نہیں رہتا، بلکہ وہ خود فریق بن جاتا ہے۔

میں بزرگ فاضل جسٹس منیر صاحب کے احترامِ واجب میں ذرا سا فرق لائے بغیر یہ کہتا ہوں کہ ردِ عمل سے پیدا ہونے والی انتہاپسندی کا زہر قومی مسائل کا تجزیہ کرنے والی لیبارٹری کے تمام کیمیاویات میں حل ہو گیا ہے۔ دوسرے لفظوں میں اس رپورٹ کے اندر قومی بلکہ دینی مسائل زہر آلود ہو کر سامنے آئے ہیں۔ کیا قوم کے روپے اور صدہا افراد کے وقت کا ایسا استعمال معقول تھا؟

دس ڈالر کی لاگت کی یہ کتاب درحقیقت اس حادثے کا نوحہ ہے کہ منیر رپورٹ مر چکی ہے — اور وہ تو جنم لینے کے ساتھ ہی مر چکی تھی۔

انسان کے لیے یہ تجربہ بہت دردناک ہوتا ہے کہ اس کی فکری یا اعتقادی ہستی اس کے سامنے موت کے گھاٹ اُتر جائے۔ یہ تو جسٹس منیر کی ہمت ہے اور ہمیں اس کی داد دینی چاہیے کہ وہ خاموشی کا ایک لمبا وقفہ گذار کر جب موقع پاتے ہیں، منیر رپورٹ کا ذکر چھیڑ دیتے ہیں اور سیکولرازم کا وعظ سنانے لگتے ہیں حتیٰ کہ اگر ان کی بات کو کوئی نہ سُن رہا ہو، کہیں اثر نہ پڑ رہا ہو، کسی کے دماغ میں تبدیلی نہ آ رہی ہو، تب بھی وہ منیر رپورٹ کی باتیں کرتے ہیں۔ اور اپنے آپ ہی کو مخاطب بنا لیتے ہیں — بات سیکولرازم کی سہی۔ مگر استقامت و استواری کی اپنی جگہ بڑی قدر و قیمت ہے۔ اس تکرارِ کلام کا ایک مقصد اپنے آپ کو اپنی مر جانے والی فکر کے زندہ ہونے کا یقین دلانا بھی ہے۔

فاضل جسٹس منیر نے اپنی تازہ کتاب میں پوری منیر رپورٹ کا خلاصہ دوہرا دیا ہے، اور یوں معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی رپورٹ کا ذکر کر کے خوش ہوتے ہیں اور مزہ لیتے ہیں، بلکہ ہو سکتا ہے کہ کوئی نفسیاتی تجزیہ کار ان کی تحریر میں "نرگسیت" کا سراغ لگا لے۔

منیر رپورٹ کی شانِ عالی لیجیے آپ رپورٹ کے متعلق جسٹس صاحب کے ارشادات ملاحظہ فرمایئے

کیونکہ داناؤں کا نظریہ یہ مشہور ہے کہ تصنیف را مصنف نیکو کند بیاں۔ جسٹس صاحب کی نیک بیانی (تلخیص کردہ) کی ایک جھلک:۔

یہ بڑی لمبی تحقیقات تھی، مگر ایک خوشگوار اور دلچسپ کام تھا۔ یکم مئی ۱۹۵۳ء کو آغاز ہوا اور ۱۰ اپریل ۱۹۵۴ء کو رپورٹ داخل کر دی گئی۔ اس میں ۱۲۰۰ صفحات پر مشتمل تحریری بیانات شامل ہیں۔ ۲۷۰۰ صفحات شہادتوں کے ہیں۔ ۳۳۹ دستاویزات لی گئی ہیں۔ ۱۰۰ صفحات خطوط کے لیے وقف ہیں۔ بے شمار کتابیں، پمفلٹ، رسائل اور اخبارات شامل ہیں۔ عدالتی تحقیقات کی اصل رپورٹ ۳۸۷ مطبوعہ صفحات پر حاوی ہے۔

اس رپورٹ کے بعد پاکستان کے متعلق جو کتابیں شائع ہوئی ہیں، ان میں سے اکثر میں اس رپورٹ کے حوالے ملیں گے۔

بیشتر پاکستانی اخبارات نے اس پر زوردار تبصرے کئے۔ بعض نے سرخیوں میں اسے "ایک عظیم دستاویز" (A GREAT DOCUMENT) اور "ایک تاریخی دستاویز" (A HISTORICAL DOCUMENT) قرار دیا۔ انگلستان اور آسٹریلیا میں بھی جرائد نے تبصرے کیے۔

پروفیسر حتّی نے تاثراتی خط لکھا اور ملاقات میں کہا کہ میں پاکستان سے ایسی کسی چیز کے نمودار ہونے کی توقع کر رہا تھا۔

کینیڈا کے ایک پروفیسر نے لکھا کہ میں نے اپنے طلبہ کے لیے موسمِ گرما کے مطالعاتی پروگرام میں اس رپورٹ کو شامل کیا ہے۔ (ص - ۴۱ - ۴۲)

رپورٹ اور شاہ ایران سب سے زیادہ قابل توجہ شاہ ایران کی دلچسپی کا ذکر اور اس کے ساتھ منیر صاحب کا دردمندانہ تاثر ہے۔ منیر صاحب بتاتے ہیں۔

شاہ ایران نے مجھ سے رپورٹ کے متعلق پوچھا تو میں نے بتایا کہ اس میں کیا کیا ہے۔ اس پر انہوں نے فرمایا کہ ایسے ہی مسائل ان کے یہاں بھی درپیش ہیں۔

یہاں بڑے حسرت و حرماں کے ساتھ جسٹس منیر فرماتے ہیں کہ:

آج ایران میں خمینی کے ہاتھوں انقلاب آچکا ہے - اسلامی ری پبلک کا قیام عمل میں آرہا ہے - شاہ اور ملکہ میکسیکو (MEXICO) میں پناہ گزین ہیں (نوٹ: کتاب کی اشاعت کے بعد شاہ کے ستارے نے اور بھی گردشیں مکمل کر لی ہیں) اور بہت سے سرجن میں شاہ کی حمایت کا سودا تھا، قلم ہو چکے ہیں - (ص - ۴۲)

اِن کلماتِ حسرت و حرماں کو پڑھ کر یہی خیال آتا ہے کہ شاہ (اور ملکہ) کی تقدیر اگر اچھی ہوتی تو وہ پاکستان سے جسٹس منیر صاحب کو بلواتے اور اپنے ہاں ایک تحقیقاتی عدالت لگوا کر تمام علماء اور مجتہدین کو اس میں پیش کرا دیتے - پھر منیر صاحب اُن کو طنز و تضحیک کا نشانہ بناتے اور خود اسلام کے قلب و جگر میں سیکولرازم کے نشتر سے عمل جراحی کرنے کے بعد ایک ایرانی منیر رپورٹ مرتب کرتے - پھر نہ خمینی کی بات کوئی سنتا، نہ دوسرے علماء کی دال گلتی، نہ شاہ اور ملکہ کو تخت اور وطن چھوڑنا پڑتا اور نہ کسی شاہ پرست کا سر قلم ہوتا - امن چین کی شاہی چلتی رہتی -

گویا منیر صاحب کے پاس روایتی جناتی کہانیوں کا کوئی "اسمِ اعظم" تھا جس کے طلسماتی عمل سے سیاسی مدّوجزر کو روکا جا سکتا تھا اور تاریخ کے دھارے کا رُخ موڑا جا سکتا تھا - کون منیر صاحب کی خدمت میں یہ عرض کرنے کی گستاخانہ جسارت کر سکتا ہے کہ دُنیا کی تاریخ تحقیقاتی عدالتوں کی رپورٹوں[۱] سے نہیں بنتی، جن کے مرتبین کا کمرۂ عدالت سے باہر عوامی سیاست کے دائرے میں کوئی مقام نہیں ہوتا، اور جن کا سارا احترام قانونِ انسدادِ توہین عدالت کے بل پر قائم ہوتا ہے - تاریخ کو تبدیل کرنے والے عوامل کا تعین اِس واقعہ کی توجیہہ سے ہو سکتا ہے کہ مکہ کے دارالندوہ کے عالیشان ایوان میں جو سردارانِ قریش عبا و قبا کے ساتھ کثیر تعداد میں مشورے کیا کرتے تھے، ان کو ایک غریبانہ سے خانۂ ارقم میں سر چھپانے والے فقیروں کے ذکر و فکر نے کس طرح زک دے دی -

خیر جسٹس منیر صاحب کو ہم کیوں مجبور کریں کہ وہ سیکولرازم کی بے جان میت کو الگ رکھ کر

---

[۱] جسٹس منیر صاحب کا زعم یہی ہے کہ اس رپورٹ میں ایسا طلسمی اثر موجود ہے -

تاریخ پر اثر انداز ہونے والے عوامل کا کھوج لگائیں۔ البتہ اُن سے ہم یہ ضرور پوچھنا چاہتے ہیں کہ آپ کی نظر میں آیت اللہ خمینی کی اسلامی ری پبلک کتنی بھی بُری ہو، آخر اُس نے ریفرنڈم کرایا ہے۔ دستور تیار کرایا ہے۔ انتخابات کرا رہی ہے۔ اس کے بالمقابل آپ میں شاہ پرستی کیوں ہے؟ آپ کو علامہ خمینی سے یہ توقع کیوں تھی کہ وہ شاہ کے نظامِ ظلم کے اُن آلہ ہائے کار کی بندوقوں اور تلواروں کو چومتے جنہوں نے حالیہ انقلاب میں کئی ہزار سروں کی فصل کاٹی اور جنہوں نے شاہ کے دور میں سیاسی اور دینی حلقوں سے صدائے اختلاف اُٹھانے والے ہر آدمی کا صفایا کر دیا۔ یہاں تک کہ شاہ کے تخت کے پائے ہمیشہ ایران کے بے گناہ مسلمانوں کے خون میں ڈوبے رہے۔ شاہ کیسا بھی خانہ برانداز چمن بنا رہا ہو اور اُس کے ان گنت کُشتگانِ ناز کے لاشے چپے چپے پر تڑپتے رہے ہوں۔ اُن کے خیال سے تو جسٹس صاحب کے کانوں پر جُوں تک کبھی نہ رینگی، مگر اب خونخوار بادشاہت کے چھینے قاتلانِ عوام کی نسبتہً بہت کم تعداد کو کیفر کردار تک پہنچانا آنجناب کو سخت ناگوار گذرا ہے۔

یہ فرق شاید اس لیے کہ شاہ بہر حال سیکولرسٹ ہونے کے لحاظ سے جسٹس منیر صاحب کا ہم مشرب تھا۔ اور کوئی سیکولرسٹ اگر کشتوں کے پشتے بھی لگا دے تو یہ حق۔ مگر آیت اللہ خمینی چونکہ اسلامی انقلاب لا کر اسلامی ری پبلک قائم کرنے کا جرم کر چکے ہیں۔ لہٰذا اُن کے دور میں کسی بدترین خونریز کی نکسیر بھی پھوٹے تو مقامِ ماتم و اضطراب ہے۔

رپورٹ کا کراماتی اثر | اب جسٹس صاحب کا ایک اور دلچسپ نکتہ اپنی رپورٹ کی شان میں سُنیے۔ ارشاد کی تلخیص یہ ہے:

> انکوائری کمیٹی کی رپورٹ حکومت کو پیش کرنے کے بعد اسلامی ریاست کا مطالبہ سرد پڑ گیا۔ علماء پس منظر میں دھکیل دیے گئے۔ پھر کوئی آواز ۱۹۶۲ء سے پہلے نہ اُٹھی۔ جب کہ جماعت اسلامی کے ایک آدمی[1] نے کابینہ میں اسلام کو نظریہ پاکستان قرار دیا۔ (۱۱۱/۷)

---

[1] یہ غالباً ذکر ہے مشرقی پاکستان کے مرحوم بیرسٹر اختر الدین صاحب کا جو ایوب صاحب کی کابینہ میں تھے، مگر اُس وقت وہ جماعت اسلامی کی نمائندگی کی پوزیشن میں نہ تھے۔

یہاں واشگاف طور پر منیر صاحب نے اپنی رپورٹ کی "کرامات" بیان فرمادی ہیں اور اس مقام پہ ایک دبا دبا سا اظہار فخر و مباحات محسوس ہوتا ہے۔

مگر کیا حالات کے متعلق یہ واقعی اور صحیح بیان (STATEMENT) ہے؟

بطور خلاصہ اس وقت کا نقشہ احوال پیش کرتے ہوئے میں یہ اشارا ضرور کرنا چاہتا ہوں کہ پاکستان کی دستور سازی میں سب سے بڑی حائل قوت سیکولر، آزاد منش مغرب پسند طبقے کی تھی جس نے ہر مرحلے پہ ناجبر بے جا سے کام لیا۔ اور ہر بار دودھ میں مینگنیاں ڈالنے کی کوشش کی۔ اس کشمکش کی وجہ سے دستور سازی کا پہلا اقدام قرار دادِ مقاصد پاس کرنے کی صورت میں مارچ ۱۹۴۹ء میں ہوا۔ ڈیڑھ سال بعد ستمبر ۱۹۵۰ء میں بنیادی اصولوں کی کمیٹی کی پہلی رپورٹ سامنے آئی۔ یہ نہ صرف قرار داد مقاصد سے کھلا تضاد رکھتی تھی بلکہ مختلف اداروں، جماعتوں، اخبارات اور علماء نے اسے "کتاب و سنت کے ساتھ منافات" — "اسلام کے نام پر سٹنٹ" — "دینی تصورات میں تحریف" — "اسلام اور جمہوریت دونوں کو چکمہ" — "شہری آزادی کا خون" — "۱۹۳۵ء کے ایکٹ سے بدتر" — قرار دیا گیا اور مطالبہ اٹھا کہ اسے ردی کی ٹوکری میں پھینک دیا جائے۔ اور یہی حشر اس کا ہوا۔ پھر اٹھارہ ماہ تک فضا ٹھنڈی رہی۔ (یہ تحقیقاتی عدالت سے پہلے کی بات ہے) اس سناٹے کو پھر مولینا مودودی مغفور نے توڑا، اور مئی ۱۹۵۲ء تک مطالبہ دستور اسلامی کی تحریک کی دوسری لہر اٹھا دی۔ ۸ نکاتی دستوری مطالبہ سامنے لا کر تقاضا کیا گیا کہ ۱۹۵۲ء کے خاتمے تک دستور بنایا جائے۔ ملک بھر میں مدوجذر پیدا ہوگیا اور خواجہ ناظم الدین نے جو وزیر اعظم تھے، بنیادی اصولوں کی کمیٹی کی دوسری رپورٹ دسمبر ۱۹۵۲ء میں پیش کردی۔ جنوری ۱۹۵۳ء میں تمام گروہوں کے علماء نے اس میں متفقہ ترامیم پیش کردیں۔ اور علماء کا یہ اتفاق ۱۹۵۱ء کے بعد دوسری بڑی تاریخی مثال ہے۔ یہی ۱۹۵۳ء تھا جب کہ اضطرابات پنجاب کا ظہور ہوا۔ اور مولینا مودودی اور ان کے بہت سے رفقائے جماعت گرفتار کر لیے گئے۔ خواجہ ناظم الدین کی وزارت ختم ہوگئی۔ پھر یکایک محمد علی بوگرا مسند حکومت پہ آگئے۔ غلام محمد کے زیر سایہ محمد علی بوگرا

۱؎ رائے عام کا تفصیلی ریکارڈ "دستوری سفارشات اور ان پر تبصرہ" کے زیر عنوان جمع شدہ ہے اور یہ کتاب شعبہ نشر و اشاعت جماعت اسلامی پاکستان نے شائع کی تھی۔

نے ایک "عبوری دستور" کا شوشہ کھڑا کیا، مگر عوامی فضا ایسی تھی اور اُسے مؤثر رکھنے کے لیے رابطہ عامہ اور اشاعتی ذرائع سے کام کرنے والے اتنا کام کر رہے تھے کہ شوشہ چل نہ سکا۔ اگر یہ خلا کا دور ہوتا تو سیکولر دستور بن کر چل جاتا۔ بوگرا صاحب نے وعدہ کیا کہ وہ ۱۹۵۴ء کے آخر تک دستور پیش کر دیں گے اور ۱۹۵۴ء ہی وہ بدقسمت سال تھا کہ دستور ساز اسمبلی توڑ دی گئی۔ اور خوف و دہشت کی تاریکیاں پھیلا دی گئیں۔ مقصد یہ تھا کہ مغرب پرست اکابر اپنی مرضی کا دستور بنا سکیں[1]۔ مگر ۱۹۵۵ء میں جب نئی دستور ساز اسمبلی آگئی اور اُس نے کام شروع کر دیا تو اسلامی دستور کا مطالبہ پھر زور پکڑ گیا۔ اسی سال مولینا مودودی مغفور رہا ہو گئے اور انہوں نے اسلامی دستور کے لیے پھر عوامی تحریک کی سلسلہ جنبانی شروع کر دی۔ نتیجہ یہ کہ ۱۹۵۶ء کا دستور مرتب ہوا اور چوہدری محمد علی کی سربراہی میں نافذ ہوا۔ اب اس دستور کے تحت ہونے والے انتخابات کو ڈیڑھ سال تک مؤخر کیا گیا۔ اور اس درمیانی وقفے میں محلاتی سازشوں کا خوب زور رہا اور پھر اس دستور سے جان چھڑانے کے لیے سکندر مرزا نے سرے سے جمہوریت ہی کو ایسی ٹھوکر لگائی کہ سب کچھ ختم ہو گیا۔ صرف مارشل لا رہ گیا۔ (غالباً یہ بھی منیر رپورٹ کی اصل کرامات)۔

اس لمبی کہانی کو بیان کرنے سے مقصود یہ ہے کہ منیر صاحب اور اُن کے ہم خیالوں کو یاد دلا دیا جائے کہ نہ صرف یہ کہ منیر رپورٹ کے آنے سے تحریک اسلامی دستور میں کوئی خلا واقع نہیں ہوا[2]۔ بلکہ تشکیل پاکستان سے لے کر اب تک اسلامی عوامل اپنا کام کر رہے ہیں۔

بات کو آگے لے چلنے سے پہلے میں بڑے ادب سے یہ کہوں گا کہ کوئی جج چاہے وہ ریٹائرڈ نہ ہوا ہو، یہ استحقاق نہیں رکھتا کہ وہ تاریخ کو جس طرح چاہے تصنیف کر دے۔ تاریخ کسی تحقیقاتی عدالت کی رپورٹ نہیں ہے کہ لکھنے والا جو رنگ بھرنا چاہے اس میں بھر دے۔ (باقی)

---

[1] یہی وہ زمانہ ہے جب کہ مشرقی پاکستان میں جگتو فرنٹ اور مغربی پاکستان میں ری پبلکن پارٹی کا ظہور ہوا جس کے متعلق بڑی خوشی کے ساتھ جسٹس صاحب فرماتے ہیں کہ دونوں کے منشوروں میں اسلام یا قرآن یا سنت کا کوئی ذکر نہ تھا (۲۱۱)۔ یعنی سیکولر جماعتیں نہیں (ص ۲۱۱) مگر یہ مصنوعی جماعتیں کتنی پا در ہوا ثابت ہوئیں۔

[2] اگر ضرورت ہو تو منیر صاحب کی خدمت میں ایسی بہت سی تقریروں اور تحریروں کا ریکارڈ پیش کیا جا سکتا ہے جو عین اس زمانے میں کی گئیں جس کے متعلق وہ دعویٰ کرتے ہیں کہ اسلامی حکومت کا تذکرہ ختم ہو گیا۔ اور علما گمنامی کے اندھیرے میں ڈوب گئے۔ ۶۲ء کے ایوبی دستور میں آخر اسلامی ریاست کی اصطلاح کہاں سے آگئی؟